8

# نماز روحانیت کا ستون ہے تربیت اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

(فرمودہ یکم اپریل 1949ء بمقام لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''دینا تو میں نے آج کچھ اَور خطبہ تھا لیکن یہاں آنے کے بعد بعض نوجوانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں نے اپنا موضوعِ تقریر بدل لیا۔

نماز اسلامی فرائض میں سے ایک نہایت ہی اہم فرض ہے اور حقیقت یہ ہے کہ روحانیت کا ستون نماز ہی ہے۔ جس نے ٹھیک طور پر نماز پڑھی اُس کا دل قائم ہوگیا اور جس کا دل قائم ہوگیا اُس کی روحانیت بھی قائم ہوگئی۔ اور جس نے ٹھیک طور پر نماز نہیں پڑھی اُس کا دل قائم نہیں ہوا اور جس کا دل قائم نہیں ہوا وہ سچے طور پر مسلمان بھی نہیں کہلا سکتا۔ وہ ایک ایسوسی ایشن کا ممبر تو ہے، وہ ایک مجلس کا ممبر تو کہلا سکتا ہے مگر وہ ایک مذہبی آدمی نہیں کہلا سکتا۔ اور نماز پڑھنے اور ٹھیک طور پر پڑھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نماز بسا اوقات ایک ایسا انسان بھی پڑھ لیتا ہے جسے مذہب

سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ لوگ دہریہ ہوتے ہیں، اسلام کے عملی طور پر منکر ہوتے ہیں مگر بوجہ اس کے کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بلکہ بعض پانچوں وقت نمازیں پڑھتے ہیں مگر پوچھو تو وہ خدا تعالیٰ کے قائل نہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم جس سوسائٹی میں رہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے طریقوں پر عمل کریں۔ ہم انگریزوں میں جاتے ہیں تو کوٹ پتلون پہنتے ہیں، چُھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں مگر ہم انگریز نہیں بن جاتے۔ اس لیے کہ جس سوسائٹی میں ہم رہیں ہمارا کام یہی ہے کہ ہم اُس کے دستور اور رسم و رواج کو مدنظر رکھیں۔ جس طرح ہم مغربی طریق اختیار کرنے کی وجہ سے یورپین نہیں بن جاتے اِسی طرح نماز پڑھ کر ہم مسلمان نہیں بن جاتے۔ ہم مغربی طریق اس لیے اختیار کرتے ہیں تا مغربی لوگوں کی انگلیاں ہماری طرف نہ اٹھیں اور ہم مجلس میں انتشار پیدا کرنے کا موجب نہ بن جائیں۔ اِسی طرح ہم مسلمانوں میں آکر نماز پڑھ لیتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی انگلیاں ہماری طرف نہ اٹھیں اور ہم مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کا موجب نہ بن جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ۔[1] یعنی کچھ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر اُن کی نماز ثواب کا موجب نہیں ہوتی، اُن کی نماز رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا موجب نہیں ہوتی۔ اُن کی نماز ایک بیکار اور لغو فعل بھی نہیں ہوتی بلکہ اُن کی نماز بے کار اور لغو فعل سے آگے بڑھ کر گناہ کا موجب ہو جاتی اور خدا تعالیٰ کا غضب اُن کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ پس ایک نماز ایسی بھی ہوتی ہے۔ اور ایک نماز ایسی بھی ہوتی ہے جو محض رسمی ہوتی ہے۔ انسان اس میں سے ایسے گزر جاتا ہے جیسے چکنے گھڑے پر سے پانی گزر جاتا ہے اور اُس پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اگر کہیں کہیں کوئی قطرہ نظر بھی آئے تو وہ گھڑے کی حرکت وغیرہ سے فوراً گر جاتا ہے۔ لیکن حقیقی نماز وہ ہوتی ہے جس کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھا جائے اور اس کے باطن کو بھی محفوظ رکھا جائے۔ یعنی نہ تو جلد جلد پڑھی جائے، نہ اس کی عبادت کو نظر انداز کیا جائے اور نہ اس میں غیر ضروری حرکات کی جائیں۔ طبعی حرکات بھی بعض دفعہ غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انسان کا اپنے جسم کو کھجلانا ایک طبعی چیز ہے۔ عام حالات میں ہم اس پر اعتراض نہیں کرتے۔ ہم شدید حالات میں نماز میں کھجلانے پر بھی اعتراض نہیں کرتے۔ بعض دفعہ کھجلی اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس سے نماز خراب ہونے لگتی ہے اور انسان اپنا جسم کھجلانے پر

مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر جن حالات میں نماز کے باہر کھجلانا جائز ہوگا نماز میں انہی حالات میں جسم کھجلانا جائز نہیں ہوگا۔ نماز کے باہر معمولی کھجلی دور کرنے کے لیے بھی کھجلانا جائز ہے لیکن نماز میں سوائے ایسی کھجلی کے جو شدید ہو اور جس کا ازالہ اگر نہ کیا جائے تو نماز کی طرف سے توجہ ہٹ جانے کا احتمال ہو عام حالات میں کھجلانا جائز نہیں۔ یہی حال جسم کی دوسری حرکات کا ہے۔ مثلاً میں اِس وقت خطبہ کے لیے کھڑا ہوں خطبہ میں ایک لات پر زور دے کر کھڑا ہونا جائز ہے لیکن نماز میں یہ جائز نہیں۔ نماز میں دونوں لاتوں کو سیدھا رکھنا ضروری ہوگا۔ اگر میں دونوں لاتوں کو سیدھا نہیں رکھ سکتا تو شریعت کہے گی کہ بیٹھ کر نماز پڑھو مگر شریعت یہ نہیں کہے گی کہ کھڑے تو ہو جاؤ مگر جس طرح چاہو لاتیں رکھ لو۔ نماز میں دونوں لاتوں کو سیدھا رکھنا اور ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا رہنا ضروری ہوتا ہے سوائے جسمانی بناوٹ کی خرابی کے۔ اِسی طرح باتیں کرتے ہوئے یا تقریر کرتے وقت ایک ٹانگ آگے بڑھا لینے اور دوسری ٹانگ کو پیچھے کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اپنی ٹانگوں کو اس طرح رکھے تو یہ جائز ہوگا۔ اس سے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، امتِ محمدیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ہماری روحانیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن نماز میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ یہ چیز نماز کے قواعد کے خلاف ہے۔ اگر ہم ان قواعد کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو نماز کے لیے مقرر کیے گئے ہیں تو ہمارا فعل ناقص اور ناتمام ہو جائے گا۔ غرض ''ہر ملکے و ہر رسمے'' جس طرح ہر ملک کے ساتھ بعض مخصوص رسوم کا تعلق ہوتا ہے اور ہر فعل کے متعلق بعض قواعد مقرر ہوتے ہیں اسی طرح نماز کے بھی کچھ قواعد ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ہر شخص کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

میں نے نماز کی طرف اپنی جماعت کو بارہا توجہ دلائی ہے اور چونکہ اپنے اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ انہیں باربار توجہ دلائی جائے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ماں باپ کا کام ہے۔ اگر وہ اپنی اولاد کو ان امور کی طرف توجہ دلاتے رہیں اور بار بار ان کے کانوں میں یہ باتیں ڈالیں، اگر وہ سات آٹھ سال کی عمر سے بچوں کو یہ باتیں بتاتے رہیں تو تین چار سال کے بعد جب وہ دس بارہ سال کے ہوں گے اور شریعت کے اس حکم کی پابندی ان کے لیے ضروری ہوگی وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ صحیح طور پر اپنے فرائض کو ادا کریں اور ایسی حرکات نہ کریں جو اسلامی آداب کے خلاف ہوں۔

بہرحال یہ ماں باپ کا کام ہے کہ وہ ان باتوں کو بار بار دہراتے اور بار بار اپنی اولاد کے ذہن نشین کرتے رہیں۔ اگر ماں باپ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں تو گھر کی بہت سی لغویتیں خودبخود دُور ہوتی چلی جائیں۔ بہت سے فسادات،، بہت سے جھگڑے، بہت سی لغویتیں اور بہت سی بے ہودہ باتیں محض اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ بچوں کو یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنا وقت کس طرح گزاریں۔ اگر ہر شخص اپنی اولاد کو نصیحت کرتا رہے اور وہ یہ خیال رکھے کہ اِس بچے کو میں نے یہ نصیحت کرنی ہے، اُس بچے کو میں نے یہ نصیحت کرنی ہے، ان کی پڑھائی کا خیال رکھنا ہے، ان کی دینی تربیت کا خیال رکھنا ہے، ان کی صحت اور جسمانی طاقت کا خیال رکھنا ہے، ان کے کیریکٹر کا خیال رکھنا ہے اور وہ اس کے مطابق ان کے لیے ایک پروگرام بنا دے اور پھر ان کی نگرانی کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے سارا دن کسی نہ کسی شغل میں مشغول رہیں گے۔ وہ لڑائی جھگڑا نہیں کرسکیں گے، وہ بیہودہ مذاق نہیں کریں گے اور لغو کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ مگر جب ماں باپ ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کرتے تو وہ ایسے طریق اختیار کر لیتے ہیں جن سے اُن کا وقت تو گزر جاتا ہے مگر کئی قسم کی بدعادات ان میں راسخ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

پھر بعض لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ باہر کلبوں میں اپنا سارا وقت گزار دیتے ہیں اور انہیں گھر کا کچھ پتا ہی نہیں ہوتا، سارا کام اپنی بیویوں کے سپرد کردیتے ہیں۔ اور جہاں بیویاں زور والی ہوں وہاں وہ بھی کہتی ہیں کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ تم کلبوں میں جاؤ اور ہم نہ جائیں۔ اور جب ماں باپ دونوں باہر چلے جاتے ہیں تو بچوں کی تربیت نوکروں کے سپرد ہو جاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نوکر کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ بچہ ٹھیک رہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سارا دن ناچتا کُودتا رہتا ہے اور نوکر پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا تو وہ خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ بڑی اچھی بات ہے اس کا مجھ پر کوئی بوجھ نہیں۔ مگر وہ جتنا ان باتوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے اُتنا ہی اخلاق سے گرتا چلا جاتا ہے۔

غرض اگر ماں باپ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور وہ بچوں کو ان کی عمر کے مطابق نصیحتیں کرتے رہیں تو یہ نصیحتیں انہیں اپنے اوقات کو صحیح طور پر استعمال کرنے اور اعلیٰ تربیت حاصل کرنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ درحقیقت اس عمر کے ساتھ کچھ مسائل کا تعلق ہوتا ہے اور ماں باپ کا

فرض ہوتا ہے کہ جیسی عمر ہو ویسی ہی نصیحتیں کریں۔ ایک چھوٹا بچہ جس وقت ہوش سنبھالتا ہے اس کے ساتھ بھی کچھ امور کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے نواسہ حضرت حسنؓ سے جبکہ وہ اڑھائی تین سال کے تھے فرمایا کُلْ بِیَمِیْنِکَ وَمِمَّا یَلِیْکَ 2 اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور تھالی میں سے وہ حصہ کھاؤ جو تمہارے قریب ہے۔ بچے کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بوٹی اٹھانے کے لیے پلیٹ میں کبھی اِدھر ہاتھ مارتا ہے کبھی اُدھر ہاتھ مارتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ جو تمہارے سامنے حصہ ہے اس میں ہاتھ ڈالو اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ۔ یہ چیز ہے جو چھٹپن سے ہی بچے کے کان میں ڈالی جاسکتی ہے۔ اس طرح سال ڈیڑھ سال کی عمر سے ان کو صفائی کی نصیحت کی جاسکتی ہے۔ یا مثلاً لوگوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو کبھی مٹھائی یا پھل وغیرہ لا کر دیتے ہیں ایسے موقع پر بچوں کو سکھانا چاہیے کہ وہ جَزَاکَ اللّٰہُ کہیں۔ بیشک بچہ اگر جَزَاکَ اللّٰہُ نہیں کہہ سکے گا تو وہ وَدَاکَ اللّٰہُ کہے گا۔ مگر اس کا وَدَاکَ اللّٰہُ کہنا بھی مبارک ہوگا بجائے اس کے کہ وہ کچھ نہ کہے۔ جس بچے کو بچپن سے ہی جَزَاکَ اللّٰہُ کہنے کی عادت ڈالی جائے گی اس بچے کے دل میں قومی احساس بہت ترقی کر جائے گا۔ قومی احساس ہمیشہ شکرمندی کے جذبہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ آخر ایک انسان اپنی قوم کے لیے کیوں قربانی کرتا ہے؟ اسی لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ قوم سے مجھے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ اور یہ شکرگزاری کا جذبہ جتنا زیادہ ہوگا اُتنا ہی وہ قوم کے لیے قربانی کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھے گا۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں کے اندر شکرگزاری کا مادہ نہیں ہوتا ان کے سامنے قربانی کا ذکر کیا جائے تو وہ کہتے ہیں مجھے کسی نے کیا دیا ہے کہ میں اس کے لیے قربانی کروں۔ حالانکہ شدید سے شدید دشمن بھی قوم سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے۔ ایک جنگل میں پڑے ہوئے انسان اور ایک گاؤں میں رہنے والے انسان میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ جنگل میں رہنے والے ہر روز نئے حادثات کا شکار رہتے ہیں۔ کہیں سانپ بچھوؤں کا خوف ہوتا ہے، کہیں شیر اور چیتے کا ڈر ہوتا ہے، کہیں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خوف ہوتا ہے، کہیں خیال آتا ہے کہ ہماری چیزوں کی حفاظت کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی اپنی جان جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ گیدڑ آجائیں گے اور چیزیں کھا جائیں گے۔ غرض کئی قسم کے خطرات ہر وقت سامنے رہتے ہیں لیکن گاؤں اور شہر میں ان

چیزوں میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا کیونکہ اردگرد ہمسائے ہوتے ہیں۔ گاؤں اور شہر آباد ہوتا ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہاں کسی حملے کا ڈر نہیں۔ گویا وہ قوم کی وجہ سے سانپوں اور بچھوؤں سے نجات پاتا ہے، وہ قوم کی وجہ سے شیروں اور چیتوں سے نجات پاتا ہے، وہ قوم کی وجہ سے گیدڑوں اور لومڑوں سے نجات پاتا ہے، وہ قوم کی وجہ سے ڈاکوؤں اور رہزنوں سے نجات پاتا ہے، وہ قوم کی وجہ سے مزدوری کرنے کے قابل ہوتا ہے، تعلیم کا انتظام ہوتا ہے، تجارت کرسکتا ہے، اِسی طرح وہ قوم کی وجہ سے اَور کئی قسم کے ضرروں سے بچا ہوا ہوتا ہے جن میں وہ مبتلا ہوسکتا تھا اگر وہ اکیلا کسی جنگل میں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی حماقت سے کہہ دیتا ہے کہ مجھے کسی نے کیا دیا۔ وہ اگر زمیندار ہے اور کھیت میں ہل چلاتا ہے تو اس کا ہل جب خراب ہوتا ہے وہ اسے لوہار کے پاس لے جاتا ہے اور کہتا ہے اسے ٹھیک کردیا جائے۔ وہ کسی بڑھئی کو لاتا ہے اور کہتا ہے چارپائی کی چُولیں درست کردے اور وہ چُولیں درست کر دیتا ہے۔ اگر قوم نہ ہوتی تو لوہار کیوں بیٹھتا، ترکھان کیوں بیٹھتا۔ آخر اس اکیلے انسان کی خاطر وہ نہیں بیٹھا۔ وہ اس لیے بیٹھا ہے کہ قوم بیٹھی ہے۔ اگر قوم نہ ہوتی تو نہ اسے لوہار ملتا، نہ بڑھئی ملتا، نہ کوئی اَور پیشہ ور ملتا۔ بیشک پیسے اس نے دیئے ہیں مگر لوہار کو اس کی قوم نے بٹھایا ہے۔ بڑھئی کو پیسے اُس نے دیئے ہیں مگر بڑھئی کو لائی قوم ہے ورنہ اس اکیلے شخص کے لیے نہ کوئی لوہار آتا، نہ نجّار آتا، نہ کوئی اَور پیشہ ور آتا۔ غرض بے جانے بوجھے ایک دشمن انسان بھی اپنی قوم سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے۔ پھر ملک میں ڈاکے پڑتے ہیں، فساد ہوتے ہیں، لڑائیاں ہوتی ہیں تو قوم کی وجہ سے اس کی بھی حفاظت ہوتی چلی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے وجود کو مدنظر رکھا جائے۔ غرض قوم کی خدمت اور اس کے لیے قربانی کرنے کا احساس ہمیشہ احسان مندی کے جذبہ سے پیدا ہوتا ہے اور احسان مندی کا جذبہ اگر بچپن سے ہی اُبھارا نہ جائے تو وہ کمزور ہو جاتا ہے اور جب یہ جذبہ کمزور ہو جائے تو قومی خدمت کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

غرض بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو بچوں کو بچپن میں ہی سکھانی چاہییں اور دنیا کی قومیں اپنے بچوں کو سکھاتی ہیں۔ یہ مرض پنجاب میں ہی پایا جاتا ہے کہ ان باتوں کو لغو اور فضول سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان میں ہی چلے جاؤ، یوپی کے علاقہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی کوئی چیز دو تو وہ فوراً کہیں گے آداب عرض، شکریہ۔ کیونکہ ماں باپ نے انہیں یہ عادت ڈالی ہوئی ہوتی

ہے۔لیکن پنجاب میں مَیں نے دیکھا ہے ایسی باتیں بچوں کو سکھائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ بیشک آداب عرض کہہ دیتے ہیں یا شکریہ کہہ دیتے ہیں لیکن اسلام نے اس غرض کے لیے **جَزَاکَ اللّٰہُ** کا لفظ رکھا ہے۔ہم ان الفاظ کی بجائے **جَزَاکَ اللّٰہُ** کا لفظ سکھا دیں گے۔

بہرحال چھوٹے چھوٹے آداب بچپن سے ہی بچوں کو سکھانے چاہییں تاکہ بڑے ہو کر یہ آداب ان کی طبیعتِ ثانیہ بن جائیں۔اسی طرح بچہ جب سکول جانے لگے تو اسے سکھانا چاہیے کہ استاد کا ادب اور احترام کرنا ضروری ہے، استاد کی خدمت کرنا ضروری ہے، استاد کی فرمانبرداری کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں علم کی کمی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ استاد کا ادب اور اس کا احترام کرنا بچوں کو سکھایا نہیں جاتا۔جس طرح ریل میں لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، سخت بھیڑ ہوتی ہے، اندر مزید آدمیوں کے آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تو لوگ پھر بھی اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے دوسروں کو دھکّے دیتے اور کہتے ہیں ''تُساں پیسے ودھ دتے ہوئے ہین اسیں پیسے نہیں دِتے''۔ اِسی طرح اساتذہ کا ادب کرنے کی اگر انہیں نصیحت کی جائے تو وہ کہتے ہیں ''اسیں فیس نہیں دیندے اوہ افسر کس گل دا ہے''۔ حالانکہ فیس اور علم کی آپس میں اتنی بھی تو نسبت نہیں جتنی زمین اور آسمان کی ہے۔مگر جب ماں باپ ہی بچوں کے کان میں یہ بات ڈالتے رہیں کہ استاد ہمارا نوکر ہے تو استاد کا ادب اور احترام بچوں کے دلوں میں کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر بچہ نماز کو جانے لگے تو ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اسے امام کا ادب کرنا سکھائیں مگر یہ بات بھی نہیں سکھائی جاتی۔

ہمارے ملک میں ایک واقعہ مشہور ہے نہ معلوم وہ سچ ہے یا جھوٹ مگر اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب میں مولویوں کی ہتک کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کوئی لڑکا ایک دن ملّاں جی کے پاس کھیر لے کر آیا اور کہنے لگا میری اماں نے یہ کھیر آپ کے لیے بھجوائی ہے۔ اس نے کہا تمہاری والدہ نے آج تک تو کبھی کھیر نہیں بھجوائی تھی آج اسے یہ کیا خیال آ گیا کہ اس نے کھیر بھجوادی؟ لڑکا کہنے لگا اماں نے کھیر پکائی تو کتا منہ ڈال گیا۔ اس پر اماں نے مجھے کہا کہ جاؤ اور مُلّاں جی کو یہ کھیر دے آؤ۔ یہ سن کر اسے سخت غصہ آیا اور اس نے تھالی اٹھا کر زمین پر دے ماری۔ تھالی مٹی کی تھی زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گئی۔ اس پر لڑکا رونے لگ گیا۔مُلّاں نے کہا تُو روتا کیوں ہے؟ آخر یہ کُتّے کا جُوٹھا تھا اور بہرحال اسے پھینکنا ہی تھا۔ اس نے کہا روتا اس لیے ہوں کہ اس

برتن میں امّاں چھوٹے بچے کو چھچھی کرایا کرتی تھی۔ اب میں گیا تو وہ ناراض ہوگی کہ تھالی کیوں نہیں لایا۔ یہ لوگوں کا اپنے امام سے سلوک ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ سب سے زیادہ معزز فرض یہ شخص ادا کر رہا ہے اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کا احترام کریں لیکن بوجہ اس کے کہ اس کا معاملہ خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے اور وہ دین کی خدمت کر رہا ہوتا ہے لوگ اُس کا ادب نہیں کرتے۔ اور جب وہ امام کا ادب نہیں کرتے تو انہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں لذت کہاں آ سکتی ہے؟

پھر شادی بیاہ کا زمانہ آتا ہے اُس وقت بچوں کو یہ سکھانا چاہیے کہ بیوی سے ایسا سلوک کیا جائے۔ اس کی دلجوئی کا کس طرح سے خیال رکھا جائے، اس کے رشتہ داروں کا کس طرح خیال رکھا جائے، اُن کے ساتھ نرمی اور محبت کا کس کس رنگ میں سلوک کیا جائے مگر ہمارے ہاں اوّل تو ان باتوں کو سکھائیں گے ہی نہیں اور اگر ماں بڑا پیار کرے گی تو کہے گی ''میں نے اپنے بچے کو بڑے نازوں سے پالا ہوا ہے اب پتا نہیں وہ ڈائن آ کر کیا معاملہ کرتی ہے''۔ پھر اَور زیادہ پیار آتا ہے تو ماں باپ کہتے ہیں دیکھو بچہ! ''گُربہ کشتن روزِ اوّل'' بیویاں جُوتوں سے سیدھی رہتی ہیں۔ اگر پہلے دن ہی تم نے رُعب نہ ڈالا تو کام خراب ہو جائے گا۔ یہ تربیت ہے جو ماں باپ اپنے بچّوں کی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''آوے کا آوا'' خراب ہو جاتا ہے۔ بیویاں بھی خراب ہو جاتی ہیں، بچے بھی خراب ہو جاتے ہیں، محلّے بھی خراب ہو جاتے ہیں، شہر بھی خراب ہو جاتے ہیں، ملک بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

پس تربیت کی طرف توجہ رکھنا ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ ہر گھر میں اولاد کی صحیح تربیت کرنا ماں باپ کے فرائض میں داخل ہے۔ جب وہ اپنے بچوں کی صحیح اور اعلیٰ تربیت کریں گے تو لازماً ایک ایسی نسل پیدا ہوگی جو اپنے بوجھوں کو آپ اٹھا سکے گی، جو دوسری معزز قوموں کے سامنے اپنی گردن اٹھا کر بات کر سکے گی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کر سکے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن سے ہی اولاد کی تربیت کا سبق دے کر صحابہؓ کو ایک ایسے رستہ پر چلا دیا تھا کہ وہ قوم جو ظاہری علوم سے بالکل نابلد تھی ایک نسل میں ہی دنیا کی معلّم بن گئی۔ اس لیے کہ ان کی اولادیں درست ہوگئیں اور اس وجہ سے ملکوں کے ملک ان کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا اُس وقت

سارے مکہ میں سات اور بعض روایتوں کے مطابق گیارہ پڑھے ہوئے آدمی تھے اور یا آپ کی زندگی میں ہی وہ زمانہ آ گیا کہ صحابہؓ قریباً سب کے سب تعلیم یافتہ تھے اور اگلی نسل کا یہ حال تھا کہ کتابیں پڑھ کر حیرت آتی ہے۔ایک شخص جوتیاں گانٹھ رہا ہے مگر ساتھ ہی ادب پر مقالہ لکھ رہا ہے، ایک ماہی گیر مچھلیاں پکڑ رہا ہے اور ساتھ ہی پرانے شعراء کے کلام پر جرح بھی کر رہا ہے۔جن پیشوں کو آج ذلیل سمجھا جاتا ہے اُنہی پیشوں سے وہ اپنی روزی کا بھی سامان پیدا کرتے تھے اور بڑے بڑے علوم بھی حاصل کرتے جاتے تھے۔اور جب ان پیشوں میں دن رات بسر کرنے والے اتنے بڑے بڑے عالم تھے تو جو لوگ علم کے لیے بالکل فارغ تھے اُن کے علم کا اندازہ لگانا کوئی مُشکل نہیں رہتا۔اب تو بڑے سے بڑے انسان کی خدمت بھی بعض دفعہ عار سمجھی جاتی ہے لیکن اُن لوگوں کے ادب اور حصولِ علم کی خواہش کا یہ حال تھا کہ ایک عباسی خلیفہ نے اپنے دو بچوں کو ایک عالم کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھایا۔ایک دن خلیفہ مسجد میں نماز کے لیے گئے تو ان بچوں کے استاد بھی اوپر سے آ گئے اور انہوں نے مسجد میں داخل ہونے پر اپنی جوتیاں اتار دیں۔اس پر دونوں شہزادے امین اور مامون جو خود بھی بڑے پایہ کے تھے آگے بڑھے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ ایک کہتا تھا میں جوتیاں اٹھاؤں گا اور دوسرا کہتا تھا میں جوتیاں اٹھاؤں گا۔بادشاہ نے یہ نظارہ دیکھا تو اس نے اپنے بچوں کو پیار کیا اور کہا کہ جس اخلاص کے ساتھ تم نے اپنے استاد کی جوتیوں کا خیال رکھا ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ تم ضرور علم حاصل کر لو گے۔

غرض علم کی قیمت کا احساس اور علم سکھانے والے کی عظمت کا احساس جب کسی انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں صرف تربیت کے لحاظ سے ہی اسے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا علم بھی ترقی کرتا ہے۔یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جس جنس کی قیمت زیادہ ہو گی تو لوگ اس کے پیچھے دوڑیں گے۔ جب علم کی قیمت زیادہ پڑے گی تو لوگ اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد بھی زیادہ کریں گے اور اس طرح نہ صرف ان کے علم کا معیار ترقی کرے گا بلکہ ان کے عمل میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جائے گا۔

پس دین کے سکھانے کی طرف ہماری جماعت کے تمام افراد کو پوری توجہ کرنی چاہیے۔ ماں باپ کو بھی، اساتذہ کو بھی، ائمہ کو بھی، ہمسایوں کو بھی بلکہ ہر شخص جو اپنے اندر دین کا کچھ بھی

احساس رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلامی رنگ میں رنگین کرے اور اپنے ہمسایوں کے بچوں کا بھی خیال رکھے۔ جب بھی موقع ملے بچوں کو بتانا چاہیے کہ نماز یوں پڑھنی چاہیے، روزہ اس طرح رکھنا چاہیے، زکوٰۃ کے متعلق اسلام کے یہ احکام ہیں، حج اس طرح کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح کھانا کھانے کے آداب بتانے چاہییں۔ انہیں نصیحت کرنی چاہیے کہ کھانا کھانے لگو تو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہو۔ کھانا ختم کرو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہو۔ سونے لگو تو یہ دعائیں پڑھ کر سوؤ۔ اٹھو تو یہ دعا پڑھو۔ کسی سے ملاقات کرو تو اِس طرح کرو۔ کوئی تحفہ دے یا تمہارا کام کر دے تو جَزَاکَ اللّٰہُ کہو۔ یہ ساری چیزیں بچوں کے ذہن نشین کرنی چاہییں اور بار بار انہیں اس طرف توجہ دلاتے رہنا چاہیے۔ اس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ ایک ایسا قومی کیریکٹر پیدا ہوجائے گا کہ احمدی بچوں اور دوسرے بچوں میں آپ ہی آپ فرق محسوس ہونے لگے گا اور لوگ ہمارے بچوں کو دیکھتے ہی پہچان لیں گے کہ یہ احمدی بچے ہیں۔

ایک چھوٹی سی بات میں دیکھ لو ابھی ایسے کئی احمدی ہیں جو داڑھی نہیں رکھتے لیکن بہرحال دوسروں کی نسبت ہماری جماعت کے لوگ زیادہ اہتمام سے داڑھیاں رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف داڑھی کی وجہ سے ہی اکثر لوگ احمدیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح جب ہمارے بچے اور نوجوان دوسروں کی چھوٹی چھوٹی خدمت پر جَزَاکَ اللّٰہُ کہیں گے، بڑوں کا ادب اور احترام کریں گے، خدا تعالیٰ کا ذکر ان کی زبانوں پر جاری رہے گا، نماز کی پابندی کریں گے، صحیح طور پر خشوع وخضوع کی عادت اختیار کریں گے تو یہ ساری چیزیں مل کر ایک ایسا اشتہار بن جائیں گی جس سے وہ فوراً پہچانے جاسکیں گے۔ اب تو لوگ صرف داڑھی دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ ''کیا آپ احمدی ہیں''؟ مگر پھر ان آداب اور اسلامی شعائر کو دیکھ کر کہیں گے کہ ''یہ شخص ضرور احمدی ہے''۔ گویا یہ جو دغدغہ3 اور شک لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے کہ شاید کسی اَور نے بھی داڑھی رکھ لی ہو اور یہ احمدی نہ ہو دُور ہوجائے گا۔ مگر یہ کیریکٹر قوم کی درستی سے پیدا ہوتا ہے کسی فرد کی درستی سے پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک چیف کورٹ کے چیف جسٹس صاحب نے مجھے ایک دفعہ سنایا کہ میں ایک دفعہ دَورہ پر گیا تو ایک سب جج صاحب جنہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی مجھے ملے۔

میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا اچھا! آپ احمدی ہیں؟ وہ فوراً سمجھ گیا اور کہنے لگا کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ سوائے احمدیوں کے اَور کوئی داڑھی نہیں رکھتا؟ میں نے کہا مجھے تو انہی لوگوں کی داڑھیاں نظر آتی ہیں جو احمدی ہیں۔ اُس وقت وہاں ایک ایسے شخص بھی بیٹھے تھے جن کی داڑھی نہیں تھی یا بہت چھوٹی تھی اور جو ہماری جماعت سے نہیں بلکہ غیر مبائعین سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہنے لگے ہمیں بھی باقی احمدیوں کی طرح داڑھی بڑھانی چاہیے یا داڑھی رکھ لینی چاہیے۔

اب دیکھو! داڑھی رکھنا بظاہر کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر صرف اسی وجہ سے اکثر احمدی پہچانے جاتے ہیں۔ اگر باقی باتیں بھی مل جائیں تو کس طرح یہ ایک سائن بورڈ ہوگا یہ بتانے کے لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو روشناس کرانے کے لیے کسی اَور چیز کی ضرورت نہیں۔ صرف ان کو دیکھنا ہی ان کو پہچان لینا ہے۔ اور اس سے بڑی شان کسی قوم کی اَور کیا ہوسکتی ہے کہ لوگ اس کے افراد کو دیکھ کر، اُن کے لباس کو دیکھ کر، اُن کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر، اُن کے اخلاق وآداب کو دیکھ کر، اُن کے بلند کیریکٹر اور کردار کو دیکھ کر فوراً پہچان لیں کہ یہ لوگ فلاں جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بابرکت ہوں گے وہ نوجوان جو اپنے عمل سے اِس قسم کے سائن بورڈ کا کام دیں گے اور خوش قسمت ہوگی وہ جماعت جس کے افراد کو روشناس کرانے کے لیے کسی اَور چیز کی ضرورت نہ ہو بلکہ ان کو دیکھنا ہی اُن کو پہچان لینا ہو"۔ (الفضل 14راگست 1949ء)

1: الماعون:5

2: بخاری کتاب الاطعمة باب التسمية على الطعام والاكل باليمين میں یہ الفاظ ہیں "كُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ"

3: دغدغہ: ڈر، خوف (اردو لغت تاریخی اصول پر جلد 9 صفحہ 267۔ 1988ء)